منٹو کا تنقیدی شعور

ڈاکٹر نسیمہ رحمٰن، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی لاہور

Abstract

Manto has not only brought the art of fiction writing to its zenith with the help of his intellect and creative abilities but has also expressed his critical insight in his criticism. As a critic of life, he not only creates super humans but also seems to explain his typical point of view about man, life, society and different aspects of art with full faith while expressing his critical sense in his non-fiction writings. From this aspect his critical writings are no less important than his fiction writings. Although Manto's prime importance is of a fiction writer, but by the way his critical intellect has evolved in his criticism that has bestowed him the status of a critic. Furthermore, his style is adorned with creative criticism that attracts us towards it. His critical writings also provide reasons if he is a fiction writer from a specific stand point then why is it so? What does he think about man, society, life, literature and art? Henceforth why his point of view is different from others? Along with these several types of questions Manto's critical intellect gets prominent in art in humans which indirectly determines ways where their point of views find open and direct expression in his critical thinking. Therefore, there is a specific sequence in his fiction writings and critical thinking.

سعادت حسن منٹو بحیثیت افسانہ نگار متنازعہ شخصیت رہے ہیں۔جن کے بارے میں ہمیشہ غیر معتدل رویے اپنائے گئے۔افسانہ نگاری کے فن کو جس طرح انہوں نے برتا وہ انہی کا خاصا تھا۔اسی لیے حسن عسکری نے انہیں موضوع اور ہیئت کا پیش رو قرار دیا ہے۔سعادت حسن منٹو کو اس کی حقیقت پسندی، دروں بینی، انسانی نفسیات کی گہری بصیرت اور سچائی کے بے باکانہ اظہار نے اسے ادب میں ایک منفرد حیثیت بخشی ہے۔مشاہدہ حیات اور اس مشاہدے کی جزئیاتی تفصیلات کے بیان پر منٹو کو بے پناہ قدرت حاصل تھی۔معاشرتی، سیاسی، سماجی ناہمواریوں، جنس، انسانی نفسیات، طبقاتی شعور کا جس طرح سے منٹو نے مشاہدہ کیا اور انہیں جس اسلوب میں پیش کیا اس سے پہلے اس طرح کسی اور افسانہ نگار نے ان موضوعات پر قلم نہ اٹھایا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان پر مقدمے بھی چلائے گئے۔

بلاشبہ منٹو کی سب سے نمایاں اور بڑی خصوصیت افسانہ نگاری کی ہے لیکن انہوں نے خاکے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہونے کی حیثیت سے منٹو پر بہت کام ہوا۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا گیا۔ کہیں مداح کا لہجہ اختیار کیا گیا تو کہیں اسے لعنت ملامت کا نشانہ بنایا گیا۔ یوں دو انتہا پسندانہ رویے اختیار کیے گئے اور دونوں منٹو سے پوری طرح انصاف نہ کر سکے۔ منٹو ایسا انسان ہے جو معاشرے کی اچھائی کو اچھائی اور برائی کو برائی کے روپ میں پیش کرتا ہے اور انقلاب کا داعی ہے وہ معاشرے کے دامن پر لگے داغ دھبوں کو دیکھ کر محض رونے کی ترغیب نہیں دلاتا بلکہ وہ ان داغوں کو دھونا اور سرے سے ختم کرنا چاہتا ہے۔

افسانہ نگار بھی زندگی کا نقاد ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو افسانے کی ہیئت میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ دوسری طرف یہی افسانہ نگار تنقیدی مضامین کی صورت میں زندگی، ادب و فن کی مختلف صورتوں کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔ افسانہ نگار کی تنقیدی تحریریں اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ اگر وہ مخصوص انداز کا افسانہ نگار ہے تو ایسا کیوں ہے؟ معاشرے اور زندگی کے بارے میں وہ کیا سوچتا ہے؟ اس کے بارے میں اس کا مؤقف کیا ہے؟ یہ مؤقف افسانوں میں فن کی صورت اختیار کر کے بالواسطہ اظہار پاتا ہے تو تنقید میں کھل کر بلاواسطہ اور براہ راست بیان کی صورت نظر آتا ہے۔

سعادت حسن منٹو بنیادی طور پر افسانہ نگار ہے اور بحیثیت نقاد ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس کی تنقیدی تحریروں پر اس طرح توجہ مرکوز نہیں کی گئی جیسے ان کی افسانہ نگاری کو توجہ کا مرکز بنایا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ مروج معنوں میں نقاد نہیں ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن اس بات سے ہم کبھی بھی صرف نظر نہیں سکتے کہ ان کے تنقیدی مضامین کی روشنی میں ان کی افسانہ نگاری، زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں نقطہ نظر اور ان کی شخصیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کیونکہ وہ معاشرے اور زندگی کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کو تنقیدی مضامین میں سیدھے سادے انداز اور افسانہ نگاری میں فنی پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔

کسی بھی تخلیق کار اور اس کی تخلیقات کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے خود اس کی اپنی تحریریں اہم ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ کہیں تو وہ اپنے نقطہ نظر کو بیان کرتا ہے کہیں خود پر ہونے والے تنقیدی اعتراضات کا جواب دیتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں اپنی اچھی یا بری رائے کا اظہار کرتا ہے۔ یوں افسانہ نگاری کی طرح تنقیدی تحریروں کے آئینے میں بھی اس کی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔

سعادت حسن منٹو نے جنسی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، علمی و ادبی مسائل کا احاطہ اپنے تنقیدی مضامین میں کیا ہے۔ ڈاکٹر علی ثناء بخاری منٹو کے مختلف النوع تنقیدی مضامین کی حدود کا تعین ڈاکٹر وحید قریشی کا حوالہ دیتے ہوئے کرتے ہیں:

> ''ڈاکٹر وحید قریشی نے مختلف النوع مضامین کی حدوں کا تعین کرتے ہوئے محدود قسم کی مضمون نگاری، تنقیدی مضامین، علمی و تحقیقی مقالہ نگاری، سنجیدہ مقالہ نگاری اور ظریفانہ یا طنزیہ مضامین کا

تذکرہ کیا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے انسٹھ مضامین لکھے جس میں متذکرہ بالا تمام اقسام کے موضوعات شامل ہیں''۔ ۱

سعادت حسن منٹو نے جتنے بھی تنقیدی اور دیگر موضوعات پر مضامین لکھے ان کے تین مجموعے ہیں:

(۱) منٹو کے مضامین (۱۹۴۲ء)

(۲) تلخ، ترش او رشیریں (۱۹۵۴ء)

(۳) اوپر، نیچے اور درمیان (۱۹۵۴ء)

ان مجموعوں کے علاوہ ''لذت سنگ'' میں بھی تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ''لذت سنگ'' میں ایسے افسانے یکجا ہیں جن پر فحش نگاری کے الزام میں زیر دفعہ ۲۹۲ مقدمات قائم کیے گئے۔ اس مجموعے میں شامل مضامین میں منٹو نے اپنے فحش نگاری کے تصور کی وضاحت کی ہے۔

منٹو کا پہلا مضمون ''میکسم گورکی۔ ملت احمر کا مایہ ناز مفکر'' ۱۹۳۹ء میں رسالہ ''ہمایوں'' میں شائع ہوا جو بعد ازاں ترمیم و اضافے کے ساتھ ''منٹو کے مضامین'' میں ''میکسم گورکی'' کے عنوان سے شامل ہے۔ جبکہ منٹو کے آخری مضمون ''کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا'' ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر علی ثناء بخاری کا کہنا ہے:

> ''کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا۔ یہ مضمون کتاب کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے اور اسی پر ان کی مضمون نگاری کا اختتام ہوتا ہے''۔ ۲

سعادت حسن منٹو کے تمام تنقیدی مضامین کو اگر موضوعات کے حوالے سے تقسیم کیا جائے تو یہ صورت بنتی ہے:

i) اشتراکیت اور روسی ادب سے متعلق مضامین جن میں ''میکسم گورکی''، کارل مارکس''، ''سرخ انقلاب''، ''کسان، مزدور، زمیندار اور سرمایہ''، جون آف آرک کا مقدمہ'' اسی رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ii) فیچر نما مضامین میں ''کرچیں اور کرچیاں''، لیچیاں، آلوچے اور الائچیاں''، ''اپنی اپنی ڈفلیاں''، اور ''چند تصویریں بتاں، چند حسینوں کے خطوط'' دیکھے جا سکتے ہیں۔

iii) فلمی صنعت سے متعلق مضامین کے ضمن میں ''میں فلم کیوں نہیں دیکھتا''، ''ہندوستانی فلم سازی پر ایک نظر''، اور فلم ''زندگی'' کا تجزیہ شامل ہیں۔

iv) مزاحیہ مضامیں: کچھ مضامین محض مزاحیہ ہیں۔ ان کا کوئی مقصد نہیں نکلتا۔ جو مزاح برائے مزاح کی ذیل میں آتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین ''کھانسی پر''، ''مفت نوشوں کی قسمیں''، اور ''اعداد کے ساتھ ادب کی چھیڑ چھاڑ'' ہیں۔

v) سیاسی مضامین کے سلسلے میں ''تجدید اسلحہ'' ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ''، ''ایمان و ایقان''، ''یوم استقلال'' اور ''ایک اشک آلود اپیل'' شمار کیے جاتے ہیں۔

vi) سوانحی مضمون میں ''میری شادی'' اہم ہے۔

vii) سماجی مسائل پر سنجیدہ مضامین میں ''محبوس عورتیں''، ''قتل وخون کی سرخیاں''، دو ''گڑھے''، ''انصاف''، ''عصمت فروشی''، ''باتیں''، ''گناہ کی بیٹیاں''، ''گناہ کے باپ''، ''شریف عورتیں اور فلمی دنیا''، ''طویلے کی بلا''، ''مجھے شکایت ہے''، اور ''لوگ اپنے اپ کو مدہوش کیوں کرتے ہیں'' شامل ہیں۔

viii) خالص طنزیہ ومزاحیہ مضامین کے حوالے سے ''چچا سام کے نام'' لکھے جانے والے نو خطوط دیکھے جاسکتے ہیں۔

ix) سماجی مسائل پر مزاحیہ انداز میں ہلکے پھلکے مضامین ''چھیڑے خوباں سے چلی جائے اسد''، ''کچھ نہیں تو عداوت ہی سہی''، ''پردے کی باتیں''، ''اگر''، ''دیواروں پر لکھنا''، ''ناک کی قسمیں''، ''اللہ کا بڑا فضل ہے''، ''ضرورت ہے''، ''بن بلائے مہمان''، ''سوال پیدا ہوتا ہے''، ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' اور ''ترقی یافتہ قبرستان'' اہم ہیں۔ان مضامین میں ''ترقی یافتہ قبرستان'' خالص انشائیہ کی ذیل میں آتا ہے۔ اس قسم کے مضامین کے سلسلے میں خود منٹو لکھتا ہے:

> ''اس آوارہ گردی سے یہ فائدہ ہوا کہ میرے دماغ میں جو گرد وغبار اڑ رہا تھا آہستہ آہستہ بیٹھ گیا اور میں نے سوچا ہلکے پھلکے مضامین لکھنا چاہئیں۔چنانچہ میں نے ''ناک کی قسمیں'' اور ''دیواروں پر لکھنا'' جیسے فکاہیہ مضامین امروز کے لیے لکھے جو پسند کئے گئے۔آہستہ آہستہ مزاج خود طنزیہ رنگ اختیار کر گیا''۔[۳۱]

مزید لکھتے ہیں:

> ''یہ تبدیلی مجھے بالکل محسوس نہ ہوئی میں لکھتا گیا اور میرے قلم سے ''سوال پیدا ہوتا ہے'' اور ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' جیسے تیز وتند مضمون نکل گئے۔جب مجھے اس امر کا احساس ہوا کہ میرے قلم نے گرد وپیش چھائی ہوئی دھند میں ٹٹول ٹٹول کر ایک راستہ تلاش کر لیا ہے تو مجھے خوشی ہوئی۔دماغ کا بوجھ بھی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔میں نے زور وشور سے لکھنا شروع کر دیا''۔[۳۲]

x) علمی وادبی مضامین کے ضمن میں ''دیہاتی بولیاں''، مجھے بھی کچھ کہنا ہے''، ''ادب جدید'' پر جو گیشوری کالج میں پڑھا جانے والا مضمون ''پیش لفظ'' (منٹو کے افسانے) ''لذت سنگ''، ''افسانہ نگار اور جنسی مسائل''، ''کسوٹی''، ''میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں''، ''ہندی اور اردو'' اور ''پس منظر فرحیہ بہ متعلق المیہ'' جیسے مضامین آتے ہیں۔

ہم انہی نکات کے پیش نظر ان کے تنقیدی شعور کی وضاحت کریں گے۔منٹو کے نزدیک ادب ادب ہی ہے۔اسے کسی خاص نظریے سے مخصوص قرار دینا اور اس کے نام مقرر کرنا ناانصافی ہے۔ہر زمانے کا ادب اپنے دور میں جدید ادب کہلاتا ہے اور اپنے سے پہلے زمانے سے بہتر قرار دیا جاتا ہے۔ادب میں یہ امتیاز اور اختلاف کا رنگ بدلتے ہوئے حالات کی بنا پر وارد ہوتا ہے۔منٹو کو بھی اپنے عہد کے حالات سے آگہی تھی۔اسی احساس کی بنا پر وہ لکھتا ہے:

> ''حالات بہت مختلف ہیں اور حالات کا یہ اختلاف ہی ادب میں مختلف رنگ پیدا کرتا ہے۔پہلے

فارغ البالی تھی۔ لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اس زمانے کے ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آسکتی ہیں۔ وہ غنودگی بھی آپ محسوس کر سکتے ہیں جو اس زمانے کے ادیبوں پر طاری تھی۔۔۔ اس عہد کا قصہ نویس جنوں اور پریوں کی داستانیں لکھ کر نام پیدا کرتا تھا۔ آج کا افسانہ نویس ان مردوں اور عورتوں کی کہانیاں لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ اس دور کا ادیب مطمئن انسان تھا۔ آج ادیب غیر مطمئن انسان ہے اپنے ماحول اپنے نظام، اپنی معاشرت، اپنے ادب حتیٰ کہ اپنے آپ سے غیر مطمئن انسان ہے۔ اس کی بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھا ہے کوئی اسے ترقی پسند کہتا ہے کوئی فحش نگاری اور کوئی مزدور پرستی''۔۵

ایک اور جگہ منٹو لکھتے ہیں:

''آج کا ادیب بنیادی طور پر آج سے پانچ سو سال پہلے کے ادیب سے کوئی زیادہ مختلف نہیں۔ ہر چیز پر نئے پرانے کا لیبل وقت لگاتا ہے۔ انسان نہیں لگاتا ہے۔۔۔ آج کے نئے مسائل بھی گزری ہوئی کل کے پرانے مسائل سے بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ جو آج کی برائیاں ہیں گزری ہوئی کل ہی نے ان کے بیج بوئے تھے۔ جنسی مسائل جس طرح آج کے نئے ادیبوں کے پیش نظر ہیں اسی طرح پرانے ادیبوں کے پیش نظر بھی تھے۔ انہوں نے ان پر اپنے رنگ سے لکھا ہم آج اپنے رنگ میں لکھ رہے ہیں''۔۶

بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے ادیب کو بھی بدل دیتے ہیں۔ اسی لیے یہ ادب کبھی جدید ادب، ترقی پسند، رجعت پسند اور فحش ادب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگر ان کی مذمت کرتے ہیں اور پسند نہیں کرتے تو اس کے لیے بہتر راستہ یہ ہے کہ ان حالات کو ہی ختم کر دیا جائے جس کی وہ ادب پیداوار ہے۔ اگر یہ حالات نہیں بدلے جا سکتے تو ادب کو خواہ کوئی نام دے دیا جائے وہ ان حالات کی عکاسی کرتا رہے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ادب کو ادب ہی رہنے دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ حالات بدل جاتے ہیں تو ادب میں بھی تبدیلی آجاتی ہے لیکن زبان وہی رہتی ہے۔ صرف لہجہ بدل جاتا ہے۔ اس بدلے ہوئے لہجے کو نیا ادب، ترقی پسند، فحش یا مزدور پرست ادب کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اہل فن اس کیفیت جذبے اور محرک کو تلاش کرتے ہیں جس نے یہ تبدیلی پیدا کی۔ منٹو کے تخلیق کردہ ادب کا بنیادی محور عام انسانی زندگی ہے۔ اس دائرے سے باہر نکل کر وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔ انسانیت اس کے نزدیک ترقی سے عبارت ہے۔ اس لیے وہ ہر انسان کو ترقی پسند دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ لکھتے ہیں:

''ادب یا تو ادب ہے ورنہ ادب نہیں۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے گدھا ہے مکان ہے، میز ہے یا کوئی اور چیز ہے۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ سعادت حسن منٹو ترقی پسند انسان ہے۔۔۔ یہ کیا بے ہودگی ہے۔ سعادت حسن منٹو انسان ہے اور انسان کو ترقی پسند ہونا چاہئے۔ ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صفت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی برائی کا ثبوت دیتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی

پسند نہیں۔یعنی وہ ترقی نہیں چاہتے۔میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا خواہشمند ہوں''۔ ۷

منٹو کی افسانوی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ برائی پھیلانے والا نہیں بلکہ برائی کو بے نقاب کرنے والا ہے اور پھر جب ہم اس کے اس بیان کا مطالعہ کرتے ہیں:

''زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھئے۔اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔میں ہنگامہ پسند نہیں۔میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔میں تہذیب و تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی۔میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا اس لیے کہ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا ہے''۔ ۸

منٹو کے تنقیدی خیالات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ منٹو کا کسی تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔وہ ادب کو ادب سمجھ کر ہی لکھتے تھے۔وہ ترقی پسندی کے بھی قائل تھے لیکن کسی ایک نظریے سے خود کو وابستہ نہیں کیا۔اس بات کی تصدیق مظفر علی سید کی اس بات سے بھی ہوتی ہے:

''منٹو کا ترقی پسند تحریک سے کوئی تعلق نہیں اور نہ انہوں نے یہ لقب کبھی پسند کیا اور نہ وہ کبھی تنظیم کے باقاعدہ رکن رہے بلکہ تحریک پسندوں نے بکثرت منٹو سے اپنی بیزاری اور لاتعلقی کا اظہار کیا اور یہ صرف اس کی شہرت تھی۔بطور فنکار کے جس نے انہیں مجبور کیا کہ کسی طرح حلقہ ارباب اسے گلے لگالیں۔یہ کام صرف ترقی پسندوں نے نہیں کیا حلقہ ارباب ذوق نے بھی کیا ہے۔چنانچہ منٹو کی وفات پر حلقہ ارباب ذوق کی تعزیتی قرارداد میں یہ غلط بیانی موجود ہے کہ مرحوم حلقہ ارباب ذوق کے بنیادی اراکین میں سے تھے۔بنیادی کیا وہ تو رکن ہی کسی جماعت کے نہیں تھے۔وہ ایک آزاد افسانہ نگار،ایک آزاد فنکار تھے اور تخلیق کار بظاہر ایسا ہی ہونا چاہئے''۔ ۹

اس ضمن میں خود منٹو کا بیان بھی ہے:

''مجھے کوئی پوچھے کہ منٹو تم کس جماعت سے ہو تو میں عرض کروں گا کہ میں اکیلا ہوں۔ہر معاملے میں اکیلا ہوں۔جس دن میرا کوئی ثانی پیدا ہو گیا میں لکھنا چھوڑ دوں گا ویسے کوئی جماعت میرے نام کو اپنی فہرست میں شامل کر کے فخر کر سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں''۔ ۱۰

ادب کو جب کوئی نام دے دیا جاتا ہے تو اس کو پرکھنے کے لئے جو معیار یا کسوٹی مقرر کی جاتی ہے اس میں وہی مخصوص نظریہ کارفرما رکھا جاتا ہے جو اس ادب سے تعلق رکھتا ہے۔لیکن چونکہ منٹو ادب کو ادب سمجھتا ہے کسی بھی فن پارے میں محض مخصوص نقطہ نظر کو تلاش کیا جائے اس کے نزدیک درست نہیں۔

''سب اپنی اپنی کسوٹی پر اس نئے ادب کو پرکھتے رہتے ہیں اور اس کا کھوٹا کھرا بتاتے رہتے ہیں۔ مگر ادب سونا نہیں جو اس کے گھٹتے بڑھتے بھاؤ بتائے جائیں۔ ادب زیور ہے اور جس طرح خوبصورت زیور خالص سونا نہیں ہوتے اسی طرح خوبصورت ادب پارے بھی خالص حقیقت نہیں ہوتے ان کو سونے کی طرح پتھروں پر گھسا گھسا کر پرکھنا بہت بڑی بے وقوفی ہے''۔[۱۱]

منٹو آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں اپنی ایک تقریر میں ادب کے بارے میں کہتے ہیں:

''ادب ایک فرد کی اپنی زندگی کی تصویر نہیں۔ جب کوئی ادیب قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے گھریلو معاملات کا روزنامچہ پیش نہیں کرتا۔ اپنی ذاتی خواہشوں۔۔۔ خوشیوں، رنجشوں، بیماریوں، تندرستیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی قلمی تصویروں میں بہت ممکن ہے آنسو اس کی دکھی بہن کے ہوں، مسکراہٹیں آپ کی ہوں اور قہقہے ایک خستہ حال مزدور کے۔۔۔ اس لیے اپنی مسکراہٹوں اپنے آنسوؤں اور اپنے قہقہوں کی ترازو میں ان تصویروں کو تولنا بہت بڑی غلطی ہے۔۔۔ ہر ادب پارہ ایک خاص فضا ایک خاص مقصد کے لیے پیدا ہوتا ہے اگر اس میں سے یہ خاص فضا یہ خاص اثر اور یہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو یہ ایک بے جان سی لاش رہ جائے گی''۔[۱۲]

اس طرح کہہ کر منٹو ادب پارے کو پرکھنے کا اصول اور معیار دیتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک تنقید نگار کے لیے ادب پارے میں کیا چیز اہمیت کی حامل ہونی چاہئے کہ وہ ادب پارے سے انصاف کر سکے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب فن پارے کو اس کے مخصوص پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے گا۔

سعادت حسن منٹو ادب کو معاشرے کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ یہ معاشرے میں موجود خوبیوں اور خامیوں کا عکاس ہوتا ہے۔ معاشرے کی بہتر یا بدتر سطح کا اندازہ ادب سے ہی ہوتا ہے۔ ادب منٹو کے نزدیک بیماری نہیں بلکہ بیماری کا ردِعمل ہے۔ اس لیے ایسا ادب جو زندگی کی کڑواہٹوں کو پیش کرے مٹھاس سے زیادہ اہم ہے۔

''اس نئے ادب کو جس میں آپ کبھی کبھی اپنا ہی عکس دیکھتے ہیں اور جھنجھلا اٹھتے ہیں۔۔۔ حقیقت خواہ شکر ہی میں لپیٹ کر پیش کی جائے اس کی کڑواہٹ دور نہیں ہوگی۔ ہماری تحریریں آپ کو کڑوی کسیلی لگتی ہیں مگر اب تک مٹھاسیں آپ کو پیش کی جاتی رہی ہیں۔ ان سے انسانیت کو کیا فائدہ ہوا ہے؟۔۔۔ نیم کے پتے کڑوے سہی خون ضرور صاف کرتے ہیں''۔[۱۳]

منٹو جہاں یہ کہتے ہیں کہ ادب صرف ادب ہے خواہ اسے کسی بھی نظریے سے متعلق کر دیا جائے وہ ادب ہی رہے گا۔ اسی طرح ان کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ ادب صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو ذہنی، جسمانی اور روحانی لحاظ سے صحت منداور تندرست ہیں۔ ان لوگوں کے لئے نہیں جو اس خوبی کے مالک نہیں ہیں۔ منٹو اس بات کو یوں کہتے ہیں:

''۔۔۔ ایک مریض جسم ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے۔ جو لوگ روحانی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں اصل میں انہی کے لیے شاعر شعر کہتا ہے، افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے

اور مصور تصویر بناتا ہے''۔۱۴؎

اپنی تنقیدی تحریروں میں منٹو خود پر لگائے گئے الزامات اور اعتراضات کے مدلل جواب دیتے ہیں۔اگر ان کے جوابات پر ہمدردانہ غور کیا جائے تو لا جواب ہونا پڑتا ہے کہ ان کے دلائل اپنی جگہ درست نظر آتے ہیں۔اس دوران ان کہ لہجہ جارحانہ بھی ہو جاتا ہے۔ادب تنقید حیات ہے تو منٹو اپنے افسانوں میں زندگی کی تنقید ہی کر رہے ہیں۔زندگی کے ان پہلوؤں کی تنقید جس پر معاشرے نے پردہ ڈال رکھا ہے، جو کریہہ، مسخ اور مکروہ ہیں اور زندگی کا ہی حصہ ہیں۔ایک نڈر اور بے باک افسانہ نگار جو باریک بین ہے جس کا مشاہدہ گہرا ہے اور جس کی فن پر گرفت بھی ہے وہ کیوں نہ معاشرے کو اس کا مسخ شدہ چہرہ دکھائے۔منٹو خود بھی یہ سوال کرتے ہیں جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

''سوال ہے جو چیز جیسی ہے اسے من وعن کیوں نہ پیش کیا جائے۔ٹاٹ کو اطلس کیوں بنایا جائے۔ غلاظت کے ڈھیر کو عود وعنبر کے انبار میں کیوں تبدیل کیا جائے۔۔۔حقیقت سے انحراف کیا ہمیں بہتر انسان بننے میں مدومعاون ہو سکتا ہے؟۔۔۔ہرگز نہیں''۔۱۵؎

یہ درست ہے کہ منٹو کے جن افسانوں پر بطور خاص اعتراضات کئے گئے طہارت پسندوں کے لئے ''خرافات''ہی ہیں۔لیکن کیا یہ''خرافات''ہمارے معاشرے ہماری زندگی کا حصہ نہیں؟ کیا اس سے انکار ممکن ہے؟ اگر نہیں تو پھر منٹو پر اعتراضات بے بنیاد ہیں۔یوں بھی منٹو کے افسانے محض برے نہیں ہیں۔انہوں نے بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔وہ معتوب اس لیے ٹھہرے کہ انہوں نے ایسے حساس موضوعات پر پہلی بار قلم اٹھایا اور بے باکانہ اظہار کیا۔جن پر پہلے اس طرح نہیں لکھا جاتا تھا جس طرح منٹو نے لکھا ہے۔پھر برائی کو اس کی تمام تر برائیوں کے ساتھ پیش کیا۔میرے نزدیک منٹو نے ان برائیوں کا ذکر کر کے ایک طرح سے ان پر بند باندھنے کی کوشش کی۔ معاشرے کو جب اس کے چہرے کا مسخ شدہ حصہ دکھایا جائے گا تو وہ اس پر چیخے گا ضرور لیکن ساتھ ہی اس میں شعور بھی اجاگر ہوگا اور ہمت بھی پیدا ہوگی کہ وہ اپنے مسخ شدہ حصہ کو بھی دیکھ سکے۔اس کا سامنا کر سکے اور جب سامنا کرے گا تو اس کے اندر سدھار کا جذبہ ضرور پیدا ہوگا۔اس کے برعکس اگر زندگی کی محض اوپری سطح کو دکھایا جائے یا مسخ شدہ حصے سے صرف نظر کیا جائے تو بدصورتی کا عمل آہستہ آہستہ سارے چہرے کو مسخ کر دے گا۔لہٰذا اس عمل کو روکنے کے لیے اس کا احساس کرانا اور آواز اٹھانا ضروری تھا۔اسی کراہت کے ساتھ جس کریہہ انداز میں یہ موجود تھا۔یہی منٹو نے کیا۔حسرت کاسگنجوی سے اس بات کی تائید بھی ہوتی ہے۔

''منٹو کا عقیدہ بنیادی طور پر اس بات پر تھا کہ ایک صحت مند معاشرہ انسانیت کی فلاح وبقاء کے لیے ضروری ہے جو لوگ مظلوم ہیں ستائے اور بھٹکے ہوئے ہیں وہ قابل نفرت نہیں۔ان سے نفرت اور حقارت انہیں اور بھی تنزلی کے غار میں دھکیل دے گی۔انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ ان اسباب پر توجہ دی جائے جن کی وجہ سے وہ انسانیت کے راستے سے بھٹک گئے۔ظلم کے خلاف جب تک آواز نہیں اٹھائی جائے گی معاشرہ یوں ہی رہے گا''۔۱۶؎

اس حوالے سے ہماری اس بات کا ثبوت خود سعادت حسن منٹو کا ادب تخلیق کرنے کا اپنا نقطہ نظر دیتا ہے:

''اے خدا۔۔۔اے ربّ العالمین۔۔۔اے رحیم اے کریم۔۔۔تو سعادت حسن منٹو کو۔۔۔۔ اس دنیا سے اٹھا لے جہاں وہ خوشبوئیں چھوڑ دیتا ہے اور بدبوؤں کی طرف بھاگتا ہے۔نور میں وہ اپنی آنکھیں نہیں کھولتا، لیکن اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ستر سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔وہ انسانوں کا ننگ دیکھتا ہے۔مٹھاسوں سے اسے کوئی رغبت نہیں کڑواہٹوں پر البتہ جان دیتا ہے، گھریلو عورتوں کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا لیکن بیسواؤں سے گھل مل کر باتیں کرتا ہے۔صاف اور شفاف پانی چھوڑ کر بدروؤں میں نہاتا ہے۔جہاں رونا ہے وہاں ہنستا ہے، جہاں ہنسنا ہے وہاں روتا ہے، کوئلوں کی دلالی میں جو اپنا منہ کالا کرتے ہیں ان کی کالک صاف کر کے ہمیں دکھاتا ہے۔تجھے بھول کر شیطان کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے جس نے تیری حکم عدولی کی تھی۔۔۔وہ بدکرداروں اور بداطواروں کے نامہ اعمال کی سیاہیاں مٹانے کی کوشش میں مصروف ہے''۔ ۱۷

منٹو ایسا نہیں ہے جو معاشرے کے عیبوں پر پردہ ڈالے۔وہ ان عیبوں سے پردہ ہٹا کر معاشرے کو اس کی اصلیت دکھاتا ہے۔وہ ان لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے جنہیں ساری دنیا حقیر اور ذلیل سمجھتی ہے مگر وہ انہیں اپناتا ہے اور ان سے پیار کرتا ہے۔منٹو گندگی کا غواص ہے وہ خود کہتا ہے:

''اور کیچڑوں کے سفید پوش لوگوں کے درمیان کود پڑا''

''یہ اور بھی فحش ہے''

''یہ اتنی کیچڑ کہاں سے لاتا ہے''

''معلوم نہیں۔۔۔کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالتا ہے''

''گندگی کا غواص جو ٹھہرا''۔ ۱۸

سعادت حسن منٹو کے افسانوں پر فحش نگاری کے مقدمات بھی چلائے گئے۔ان کی تنقیدی تحریروں میں ایسے مضامین بھی شامل ہیں جن میں وہ اپنے ان افسانوں کا دفاع کرتے ہیں جن پر مقدمات چلائے گئے۔ان مقدمات کی وجہ سے ادب میں فحاشی کی بحث سامنے آئی۔منٹو کے جن افسانوں (کالی شلوار، دھواں، بو، اوپر نیچے اور درمیان، پھاہا) پر مقدمات چلائے گئے ''لذت سنگ'' کے مضامین و مقدمات ان افسانوں پر ہونے والے فیصلوں اور منٹو کے مؤقف پر مشتمل ہیں۔''لذت سنگ'' میں مقدمات پر ہونے والی کاروائی کی روداد اور تین مضامین بعنوان ''سفید جھوٹ''، ''افسانہ نگار اور جنسی مسائل'' اور ''کسوٹی'' شامل ہیں۔ان مضامین میں ''سفید جھوٹ''، ''مضامین منٹو'' میں 'مجھے بھی کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے شامل ہے۔آخر میں دو عدالتی فیصلے ہیں اور تراجم ہیں۔بعنوان ''ایک فیصلہ'' حسن عسکری کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔یہ فیصلہ جیمس جوائس کی ''یولیسز'' کو غیر فحش قرار دینے کا ہے۔دوسرا ترجمہ محمد صاحب طاہر نے کیا ہے جو

اسکارٹن کیلڈ ویل کی تصنیف ''گوڈز لٹل ایکٹر'' پر ہونے والے مقدمہ کا فیصلہ ہے۔ جو ''ایک اور فیصلہ'' کے عنوان سے شامل ہے۔ عدالتی فیصلوں کے یہ دونوں تراجم منٹو کے عدالتی بیان کی وضاحت کرتے ہیں۔

''لذت سنگ'' کے عنوان سے جو مقدمہ تحریر کیا اس میں وہ پورا مضمون بھی شامل ہے جو منٹو نے جوگیشوری کالج میں ادب جدید کے موضوع پر پڑھا تھا۔ یہ تقریر نما مضمون ''منٹو کے افسانے'' کے مجموعہ میں بطور مقدمہ پیش لفظ کے شامل ہے۔ اس مضمون کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ منٹو کے افسانوں کی طرح ان کے اس مضمون پر بھی حکومت پنجاب نے مقدمہ چلایا:

> ''اس تقریر یا مضمون پر حکومت پنجاب نے زیر دفعہ ۳۰ ڈیفنس آف انڈیا رولز مقدمہ چلایا۔ الزام یہ ہے کہ اس میں حضور ملک معظم کی ''فورسز'' کے متعلق ایسی غلط باتیں موجود ہیں جن سے ان کو ضعف پہنچ سکتا ہے''۔۱۹

مضمون ''مجھے بھی کچھ کہنا ہے'' میں بھی منٹو اپنے افسانوں کا دفاع کرتے ہیں۔ اپنے اوپر لگے فحش نگار کے الزام کو رد کرتے ہوئے دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ محض الزام ہے کیونکہ وہ اپنے افسانوں میں جو کچھ لکھتے ہیں یا جو واقعہ بیان کرتے ہیں اسے جس نظر اور زاویئے سے دیکھتے ہیں اسے اسی طرح دوسروں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ یہ بات ان کے افسانوں کے علاوہ تنقیدی مضامین پر بھی صادق آتی ہے۔

> ''میں ایک ایسا انسان ہوں جو رسالوں اور ایسی کتابوں میں لکھتا ہے اور اس لیے لکھتا ہے کہ اسے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ جو کچھ دیکھتا ہوں جس نظر اور جس زاویئے سے دیکھتا ہوں وہی نظر وہی زاویہ میں دوسروں کے سامنے پیش کر دیتا ہوں''۔۲۰

سعادت حسن منٹو اس حوالے سے ایک ادیب کا منصب بھی متعین کر دیتے ہیں۔

> ''ہم لکھنے والے پیغمبر نہیں۔ ہم ایک ہی چیز کو ایک مسئلے کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور کبھی مجبور نہیں کرتے کہ وہ اسے قبول ہی کرے۔ ہم قانون ساز نہیں۔ احتساب اور قانون سازی دوسروں کا کام ہے۔ ہم حکومتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن خود حاکم نہیں بنتے۔ ہم عمارتوں کے نقشے بناتے ہیں لیکن معمار نہیں۔ ہم مرض بتاتے ہیں لیکن دواخانوں کے مہتمم نہیں۔۔۔ ہم رجائی ہیں۔۔۔ دنیا کی سیاہیوں میں بھی ہم اجالے کی لکیریں دیکھ لیتے ہیں۔ ہم کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔۔۔صرف اس لیے کہ ہم اس واقعے کی تصویر ہی نہیں بلکہ اس کے اصل محرک کی وجہ بھی پیش کر سکیں''۔۲۱

ڈاکٹر علی ثناء بخاری نے منٹو کے مضمون ''مجھے بھی کچھ کہنا ہے'' سے سعادت حسن منٹو کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔

> ''اس میں شک نہیں کہ تخلیقی فنکار ناقدانہ شعور رکھتا ہے لیکن منٹو نے اپنے اس مضمون میں جس

انداز میں اپنے افسانے کا تجزیہ کیا ہے اس سے نہ صرف یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ منٹو کی تحریریں بلا مقصد نہیں ہوتیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی گہری تنقیدی بصیرت کی وجہ سے منٹو نے یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ وہ جتنے بڑے افسانہ نگار ہیں اتنے ہی بڑے تنقید نگار بھی ہیں'' ۔۲۲

سعادت حسن منٹو سلیقے کے بہت قائل ہیں۔ان کے نزدیک اگر ناگوار چیز بھی سلیقے سے پیش کی جائے تو ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔اس سلسلے میں زبان کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ زبان میں بہت کم الفاظ فحش ہوتے ہیں۔ طریق استعمال ہی ایک ایسی چیز ہے جو پاکیزہ سے پاکیزہ الفاظ کو بھی فحش بنا دیتا ہے۔اس لیے کوئی بھی چیز فحش نہیں، ہر چیز فحش ہوسکتی ہے اگر ان کو فحش طریقے پر پیش کیا جائے۔منٹو کا کہنا درست ہے کہ چیزیں فحش نہیں ہوتیں بلکہ کسی خاص غرض کے تحت انہیں فحش بنایا جاتا ہے۔اس ضمن میں وہ مثال بھی دیتے ہیں کہ اس کے نزدیک مرد اور عورت کا رشتہ اور ذکر فحش نہیں بلکہ اس رشتے کو غلط زاویے سے دیکھنا اسے فحش سے زیادہ نہایت گھناؤنا،مکروہ اور غیر صحت مند قرار دیا جائے گا۔منٹو کا یہ مؤقف اپنی جگہ درست ہے اور فحاشی کے مفہوم کی وضاحت میں مدد دیتا ہے۔

''تحریر و تقریر میں شعر و شاعری میں سنگ سازی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہیے۔اگر یہ ترغیب موجود ہے اگر اس کی نیت کا ایک شائبہ بھی نظر آ رہا ہے تو وہ تحریر، وہ تقریر، وہ شعر، وہ بت قطعی طور پر فحش ہے'' ۔۲۳

سعادت حسن منٹو نے عریانی اور فحاشی کی پرکھ کے لیے ایک معیار دیا ہے جس کے مطابق ان پر فحش یا غیر فحش ہونے کا الزام عائد کرنا چاہیے۔یہ الزام دینے کا حق بھی صرف ایسے نقاد کے پاس ہو جو تنقید کے فن سے آگہی رکھتا ہو نہ کہ کسی روزنامہ اخبار کو یہ اختیار دیا جائے۔اس ضمن میں خود منٹو کی تحریر ملاحظہ ہے:

''کسی ادب پارے کے متعلق ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر، ایک اشتہار فراہم کرنے والے اور ایک سرکاری مترجم کا فیصلہ صائب نہیں ہوسکتا۔۔۔کیونکہ کسی بڑے شاعر، کسی بڑے افسانہ نگار کے افسانوں پر صرف وہی آدمی تنقید کرسکتا ہے جو تنقید نگاری کے فن کے تمام عواقب و عواطف سے آگاہ ہو'' ۔۲۴

منٹو کا فحاشی کے ضمن میں یہ استدلال بالکل درست ہے کہ ایک تنقید نگار ہی اس بات کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ کوئی تحریر فحاشی کی ترغیب کے زمرے میں آتی ہے یا کسی خاص پس منظر یا صورتحال کی وضاحت کے لیے اس کا ذکر ضروری ہے۔اس ضمن میں اکارٹن پر چلائے جانے والے فحاشی کے مقدمہ میں امریکی جج نے فیصلہ سناتے ہوئے جو رائے دی منٹو اس سے اتفاق کرتے ہیں انھوں نے اپنے اوپر چلائے جانے والے مقدمات میں بھی دلیل کے طور پر یہی مؤقف اپنایا تھا۔

''میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ ایسی کتابوں کو سختی سے دبا دینے اور پڑھنے والوں میں خواہ مخواہ تجسس اور استعجاب پیدا ہوتا ہے جو شہوت پسندی کی ٹوہ لگانے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔حالانکہ اصل کتاب میں مصنف نے نہ صرف وہی چیز منتخب کی ہے جسے وہ امریکی زندگی کے کسی مخصوص طبقے

سے متعلق سچا خیال کرتا ہے۔میرے خیال میں سچائی کے ادب کے لیے جائز قرار دینا چاہیے‘‘۔۲۵

امریکی جج کی یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ ایسے الزامات لگانے سے فن پارے کی اصل ادبی صورت سامنے ہی نہیں آپاتی اور اس کے بجائے لوگ محض لذت پسندی کی ٹوہ لگا رہے ہوتے ہیں یوں فن پارے کی ادبیت مجروح ہو جاتی ہے۔ان تمام تنقیدی نکات کے پیش نظر منٹو کا اپنے افسانے ’’ٹھنڈا گوشت‘‘ پر اعتماد ہے کہ وہ اس میں انسان کی خاص نفسی کیفیت کا تجزیہ کرتا ہے نہ کہ فحاشی کی ترغیب دیتا ہے۔وہ اس سے بے نیاز ہو چکا ہے کہ اس پر فحاشی کا الزام لگے گا۔لہٰذا وہ ضرور ان حوالوں سے لکھے گا۔

’’میں تحریر و تصنیف کے جملہ آداب سے واقف ہوں۔۔۔میرے قلم سے بے ادبی شاز و نادر ہی ہو سکتی ہے۔میں فحش نگار نہیں افسانہ نگار ہوں‘‘۔۲۶

ایک اور جگہ منٹو لکھتے ہیں:

’’افسانہ نگاری میرا پیشہ ہے میں اس کے تمام آداب سے واقف ہوں اس سے پیشتر اسی موضوع پر میں کئی افسانے لکھ چکا ہوں۔ان میں سے کوئی بھی فحش نہیں میں آئندہ بھی اسی موضوع پر افسانے لکھوں گا۔جو فحش نہیں ہوں گے‘‘۔۲۷

سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانوں کے حوالے سے عائد ہونے والے الزامات کو غلط ثابت کرنے کے لیے جن دلائل کو پیش کرتے ہیں اور جیسے اپنے افسانہ کا دفاع کرتے ہیں ان پر ہونے والے اعتراضات ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ایسے مضامین جن میں وہ اپنے افسانوں کا دفاع کرتے ہیں اور ان پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں انہیں پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اعتراض کرنے والوں نے منٹو کے افسانوں کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں۔محض اس کے کسی حصے پر اعتراض کر کے ان پر الزام عائد کیا اور اس کی وجہ یہ کہ وہ جس طبقہ کی عکاسی کرتا ہے اسے بالکل ویسے ہی پیش کرتا ہے۔جیسی کہ وہ ہیں۔اس پیش کش کا بیان لذت پسندی کے بجائے کراہت کا عنصر لیے ہوئے ہے۔

ایسے میں حیرت ہوتی ہے کہ ان کے افسانوں کی اصل روح تک رسائی حاصل نہ کرنے کی وجہ سے انہیں معتوب ٹھہرایا گیا۔ادب قوم کا سرمایہ ہوتا ہے،مومنؔ،میرؔ،احسنؔ،شوقؔ،سعدیؔ،حافظؔ وغیرہ کی تخلیقات میں بھی فحاشی کا شائبہ نظر آتا ہے لیکن چونکہ وہ ادب کا سرمایہ ہیں اس لیے ان پر یہ الزام عائد نہیں کیا جاتا۔اگر ان پر الزام لگا دیا جائے تو ادب ان کے وجود سے خالی ہو جائے گا۔پھر خصوصاً جب مرزا شوقؔ،مومنؔ،جرأتؔ اور آتشؔ وغیرہ کی مثنویات کو مدنظر رکھا جائے تو منٹو پر لگائے گئے الزامات غلط ہو جاتے ہیں۔اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ منٹو کے افسانے بھی ادبی معیار کے ہیں اس لیے وہ بھی فحاشی سے مبرا ہیں۔

افسانوں کی طرح تنقیدی مضامین بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ خود کو نام نہاد ناصح اور معلم اخلاق نہیں سمجھتے بلکہ وہ تو خارج کا ایسا مشاہدہ کرنے والا ہے کہ خارج کے اثر کو باطن پر اثر انداز ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور اسے من وعن بیان کر دیتا ہے۔منٹو کا یہ خیال درست ہے کہ انسان اپنے اندر کوئی برائی لے کر نہیں پیدا ہوتا۔اچھائیاں

اور برائیاں اس کے دل و دماغ میں باہر سے داخل ہوتی ہیں۔بعض ان خوبیوں اور خامیوں کی پرورش کرتے ہیں اور بعض ایسا نہیں کرتے۔اس لیے خارج میں جو برائیاں ہیں ہمیں انہیں ختم کرنا چاہیئے۔بجائے کہ فحاشی فحاشی کے نعرے لگا کر ایسے ادب پاروں کی ادبیت کو مجروح کیا جائے جو خارج کے اثرات انسان کے باطن پر دکھاتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو نے اپنے تنقیدی مضامین میں ایک نئی بات یہ کی کہ اپنے عہد میں پہلی بار اپنے افسانوں کے حوالے سے ادب میں فحاشی کے سوال کو اٹھایا اور تنقیدی نقطہ نظر سے ادب اور فحاشی کا جائزہ لیا گیا۔گو کہ فحاشی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا لیکن اس ضمن میں جتنے بھی فیصلے سامنے آئے اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ایسی ادبی تحریریں جن کا مقصد انسانی نفسیات یا انسانی برائی کو اجاگر کرنا ہو اور جس میں لذت پسندی کا شائبہ نہ ہو تو ایسی تحریریں فحش نہیں۔یوں منٹو نے اپنے افسانوں اور تنقیدی شعور کی وساطت سے اردو ادب میں ایک راستہ بنایا اور بہت حد تک ہم منٹو کے تنقیدی خیالات سے ادب میں فحاشی کے مفہوم سے آگاہ ہوتے ہیں۔سعادت حسن منٹو نے اپنے اردگرد بکھرے ہوئے مسائل کو محسوس کرنے اور ان کا گہرائی سے مشاہدہ کرنے کے بعد انہیں ایک طرف افسانوی پیرایہ میں بیان کیا تو دوسری طرف ان مسائل کو سنجیدگی سے تنقیدی مضامین کی صورت میں براہ راست بیان کیا۔

منٹو کے بیشتر افسانوں کا موضوع ''طوائف'' ہے۔اس کے نزدیک یہ طبقہ معارے اور سماج کا پیدا کردہ ہے۔ہمارے اس سماج کا جو بظاہر اس طبقے کو لعنت ملامت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے لیکن اپنی ہی احتیاج کی خاطر انہیں جنم دیتا ہے۔منٹو معاشرے کے اس دوہرے معیار پر کڑی تنقید کرتا ہے۔وہ اس عورت کا چہرہ دکھاتا ہے جو اس طوائف کے اندر چھپی بیٹھی ہے۔منٹو نے کھل کر اس موضوع پر افسانے اس لیے لکھے کہ خود اس کا مشاہدہ اس ضمن میں گہرا تھا۔اسی لیے منٹو کہتا ہے کہ ہر عورت طوائف نہیں ہوتی اور ہر طوائف عورت ہوتی ہے۔

انھی تصورات و نظریات کو منٹو نے اپنے مقالات و مضامین کی صورت میں براہِ راست پیش کیا ہے جبکہ علامتوں اور اخفا کے وسیلے سے افسانوں اور تمثیلوں میں بیان کرتا ہے۔یوں ہم ان کے تنقیدی شعور کو ہی منٹو کا سرمایہ حیات قرار دے سکتے ہیں جس کے لیے وہ عمر بھر کوشاں رہے۔راقمہ اپنے استدلال کو ڈاکٹر اے بی اشرف کی اس بات پر ختم کرتی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ علی ثناء بخاری،سعادت حسن منٹو۔ حیات و کارنامے،(غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی)،(لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۸۴ء)،ص:۲۹۲

۲۔ ایضاً،ص:۳۱۵

۳۔ سعادت حسن منٹو،''رحمت مہر درخشاں''،مشمولہ ٹھنڈا گوشت(منٹو نامہ)،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء)،ص:۳۵۳

۴۔ ایضاً،ص:۳۵۳

۵۔ سعادت حسن منٹو،''پیش لفظ''،مشمولہ منٹو کے افسانے (منٹو راما)،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)،ص:۷۰۲۔۷۰۱

۶۔ ایضاً،لذت سنگ،(لاہور: نیا ادارہ،سن ندارد)،ص:۱۱۶

۷۔ ایضاً،''پیش لفظ''،مشمولہ منٹو کے افسانے (منٹو راما)،ص:۷۰۰

۸۔ ایضاً،ص:۷۰۴

۹۔ دستاویز،(راولپنڈی: شمارہ ۲۰،جلد اوّل،جنوری تا مارچ،۱۹۹۰ء)،ص:۶۰

۱۰۔ سعادت حسن منٹو،''پیش لفظ''،مشمولہ منٹو کے افسانے (منٹو راما)،ص:۷۰۱

۱۱۔ ایضاً''کسوٹی''،مشمولہ لذت سنگ،ص:۱۲۳

۱۲۔ ایضاً''مقدمہ لذت سنگ''،مشمولہ لذت سنگ،ص:۴۷۔۴۸

۱۳۔ ایضاً''افسانہ نگار اور جنسی مسائل''،مشمولہ لذت سنگ،ص:۱۲۲

۱۴۔ ایضاً''مقدمہ لذت سنگ''،مشمولہ لذت سنگ،ص:۴۴

۱۵۔ ایضاً''زحمت مہر درخشاں''،مشمولہ ٹھنڈا گوشت،(منٹو نامہ)،ص:۳۷۶

۱۶۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی،پرکھ،(کراچی: سندھ ایجوکیشنل اکیڈمی،۱۹۸۱)،ص:۷۶

۱۷۔ سعادت حسن منٹو،''پس منظر''،(فرحیہ متعلق بہ المیہ)،مشمولہ اوپر نیچے درمیان (منٹو راما)،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء)،ص:۲۶۴

۱۸۔ ایضاً،ص:۲۶۳

۱۹۔ سعادت حسن منٹو،''مقدمہ لذت سنگ''،مشمولہ لذت سنگ،ص:۲۳

۲۰۔ ایضاً''سفید جھوٹ''،مشمولہ لذت سنگ،ص:۱۰۲

۲۱۔ ایضاً،''افسانہ نگار اور جنسی مسائل''،مشمولہ لذت سنگ،ص:۱۱۸

۲۲۔ علی ثنا بخاری،''سعادت حسن منٹو۔ حیات و کارنامے''،(غیر مطبوعہ مقالہ پی ایچ ڈی)،ص:۲۹۹

۲۳۔ سعادت حسن منٹو،''مقدمہ لذت سنگ''مشمولہ لذت سنگ،ص:۴۰

۲۴۔ ایضاً،ص:۳۸

۲۵۔ سعادت حسن منٹو،''چچا سام کے نام ایک خط''مشمولہ اوپر نیچے اور درمیان (منٹو راما)،ص:۳۵۸

۲۶۔ ایضاً''مقدمہ لذت سنگ''،مشمولہ لذت سنگ،ص:۲۸

۲۷۔ ایضاً''سفید جھوٹ''،مشمولہ لذت سنگ،ص:۱۰۱

ماخذ:

۱۔ حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر، پرکھ، کراچی: سندھ ایجوکیشنل اکیڈمی، ۱۹۸۱ء۔

۲۔ دستاویز، راولپنڈی: شمارہ ۲۰، جلد اوّل، جنوری تا مارچ، ۱۹۹۰ء۔

۳۔ علی ثناء بخاری، سعادت حسن منٹو-حیات و کارنامے، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی)۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء۔

۴۔ منٹو، سعادت حسن، لذت سنگ، لاہور: نیا ادارہ، سن ندارد۔

۵۔ منٹو راما، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔

۶۔ منٹو نامہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔

۷۔ منٹو نما، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء۔

☆☆☆